پروفیسر سید عابد علی عابد
مترجمہ سجاد رضوی

حافظ شیرازی

پارس یا فارس کے صوبے کو (جسے یونانی پرسیس لکھتے ہیں) ایران کی تاریخ میں اتنا اہم مقام حاصل رہا ہے کہ یونانیوں نے سارے ملک کو پرشیا کے نام سے موسوم کیا۔ (عہد دورِ جدید میں پرشیا کی جگہ ایران کا لفظ استعمال میں آیا) کوروشِ کبیر[1] جس نے ۵۵۸ سے ۵۳۰ ق م تک ایران پر حکومت کی اسی صوبے کا باشندہ تھا اور یہیں پر سلطنت ہخامنشی کی داغ بیل پڑی تھی۔ قدیم ترین زمانے سے اب تک اس صوبے نے تاریخ ایران میں اپنے آپ کو پیش پیش رکھا ہے۔ اس صوبے کے بعض حصوں کی آب و ہوا تو لاجواب ہے۔ یہاں کے باشندوں نے ہر قسم کے نشیب و فراز دیکھنے کے باوجود اپنے دلوں میں حُسن پرستی کا چراغ روشن رکھا ہے۔ یہاں کے صنعت گر اور دستکار اپنے اپنے نمونہ ہائے فن میں ذوقِ سلیم کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ لا استرانشر، صاحبِ "سرزمینِ خلافتِ مشرقی" نے لکھا ہے کہ مختلف قسم کے پھولوں بالخصوص گلاب کی کثرت کی بنا پر یہ صوبہ ایران کے بہترین عطر ممالک غیر کو برآمد کیا کرتا تھا۔

شیراز اس صوبے کا صدر مقام ہے۔ بڑا پرانا شہر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ شہر محمد ابنِ یوسف ثقفی نے کہ حجاج ابنِ یوسف ثقفی کا بھائی تھا ۷۴ھ میں ایران قدیم کے دارالخلافہ اصطخر کے خرابوں سے کچھ دور آباد کیا تھا۔ اس بارے میں بھی شہادت ملتی ہے کہ ساسانیوں کے زمانے میں بھی یہ شہر موجود تھا۔ پرسی پولس کے خرابوں سے کہ شیراز کے قریب ہی واقع ہیں اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ اس شہر کے گردونواح کا علاقہ ایران کی شان و شوکت کا مرکز[2] تھا۔ شیراز کے لغوی معنے شکم سیر ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کو شیراز اس بنا پر کہا گیا کہ یہاں کے باشندے بہت تھوڑے عرصے میں ان تمام اشیائے خوردونوش کو چٹ کر جاتے تھے جو دوسرے علاقوں سے یہاں لائی جاتی تھیں۔ اس شہر نے فلسفیوں، مفکروں، صوفیوں، علمائے دین اور محققین کو جنم دیا ہے۔ لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ اسے اپنے شاعروں پر بڑا ناز ہے۔ یہاں اس سلسلے میں چند نام گنوا دینے کافی ہونگے۔ ادیب، انور، اہلی، حجاب، بسمل، خرّم، زکی، حافظ، سعدی، شوریدہ، عرفی اور کئی سبھی شیراز کے باشندے تھے۔ سعدی کو ایران کا بہترین

---

[1] یہ کوروش کبیر وہی شہنشاہ ہے جسے قرآن نے ذوالقرنین کہا ہے۔

[2] شہر ہائے نامی ایران چاپ خانۂ عرفان (اصفہان ۱۳۲۹) اور تذکرۂ جغرافیائی تاریخی ایران (تہران بہمن ۸-۱۳)

غزل گو قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن بعض دوسرے لوگ یہ مقام حافظ کو عطا کرتے ہیں اور میری رائے یہ ہے کہ ان کی بات بڑی محکم دلائل پر مبنی ہے۔

حافظ کی تاریخ ولادت کے بارے میں آراء میں اختلاف ہے۔ لیکن اس کی تاریخ وفات اس قطعہ سے نکلتی ہے:

چراغ اہل معنی خواجہ حافظ — کہ شمعی[۵۱] بود از نور تجلی
چو در خاک مصلی یافت منزل — بجو تاریخش از خاک مصلی

اور اس حساب سے حافظ نے ۷۹۱ھ میں انتقال کیا[۵۲]۔

بعض سوانح نگار اور ناقد یہ لکھتے ہیں کہ حافظ نے چھیالیس برس کی عمر میں انتقال کیا۔ یہ بات بدیہی طور پر غلط ہے۔ ۷۹۱ میں سے ۴۶ منہا کیے جائیں تو ۷۴۵ بچتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نکلا کہ حافظ کا سن ولادت ۷۴۵ھ ہے۔

اب یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ ابو اسحاق اینجو مبارز الدین محمد کے دباؤ کی بنا پر ۷۵۴ھ میں شیراز سے بھاگا تھا۔ اور چار سال تک شب و روز کی سرگردانی اور جان بچانے کی کوششوں کے بعد ۷۵۸ھ میں مارا گیا۔ اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ حافظ ابو اسحاق اینجو سے کہ متفقہ طور پر حافظ کا پہلا مربی ہے ۷۵۴ھ میں ملے تو ہمیں یہ بات ماننا لازم آتی ہے کہ حافظ نو برس کی عمر میں ادبی شہرت حاصل کر چکے تھے اور وہ فارس کے حکمرانوں کے منظور نظر ہو چکے تھے، اور ظاہر ہے کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس بات سے بحث کرنا بھی فضول ہے کہ ابو اسحاق اینجو اپنی زندگی کے آخری چار سالوں میں یعنی ۷۵۴ھ سے ۷۵۸ھ تک اس قابل تھا کہ وہ کسی شخص کی کچھ مدد کر سکتا۔ اس سلسلے میں عبدالنبی صاحب "میخانہ"[۵۳] کا یہ بیان درست معلوم ہوتا ہے کہ حافظ نے پینسٹھ برس کی عمر میں انتقال کیا ہے اس حساب سے حافظ کی تاریخ ولادت ۷۲۶ھ بیٹھتی ہے۔ تمام جدید مصنفین اور ناقدوں نے اس سے اتفاق کیا ہے[۵۴]۔

حافظ کی زندگی کے ابتدائی حالات اس کی تحصیلات علمی اور اس کی مربیانِ ادب و فن سے ملاقات کا ذکر کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو روایات سے بحث کی جائے۔ جن کا اکثر مقامات پر ذکر ہوتا ہے۔ ایک کا تعلق اس بات سے ہے کہ اس نے ایکا ایکی شعر گوئی کی قوت حاصل کر لی۔ اور دوسری کا

---

۵۱ بعض نسخوں میں شمعی کی بجائے شمسی بھی درج ہے۔

۵۲ خ = ۶۰۰، ا = ۱، ک = ۲۰، م = ۴۰، ص = ۹۰، ل = ۳۰، ی = ۱۰ میزان ۷۹۱

۵۳ عبدالنبی اصلاً قزوین کا رہنے والا تھا۔ اور ۱۰۱۸ھ میں ہندوستان چلا آیا تھا۔ میخانہ کا سن تالیف ۱۰۲۹ھ ہے۔

۵۴ دیباچۂ دیوان حافظ از ح پژمان (چاپ خانہ شرکت تضامنی علمی ۱۳۱۸)، تمام حوالے اسی دیوان سے متعلق ہیں۔ تاریخ ادبیات ایران سلیم نیساری تہران ۱۳۳۸ (اشاعت سوم)

اس کی فرضی محبوبہ شاخِ نبات سے جسے اہلِ لغت بھی بالعموم حافظ کی محبوبہ ہی قرار دیتے ہیں[۱]۔

صاحب "میخانہ" نے پہلے قصے کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ہم یہاں اس کی خاص خاص باتیں بیان کرتے ہیں۔ اپنے والد بہاؤالدین کی وفات کے بعد حافظ کو سخت مفلسی کا سامنا کرنا پڑا اور اس نے ایک نانبائی کی دکان پر ملازمت اختیار کر لی۔ اس نانبائی کی دکان کے پاس ایک مدرسہ تھا۔ حافظ نے تحصیلِ علم سے دلی لگاؤ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس مدرسے میں جانا شروع کر دیا۔ اس مدرسے کے قرب و جوار میں ایک بزاز کی دکان تھی جسے ادب و فن کا بڑا شوق تھا اور جس کی دکان شاعروں اور فن کاروں کی آماجگاہ تھی۔ حافظ بھی کبھی کبھی اس کی دکان پر چلے جاتے اور اپنے موزون کئے ہوئے اشعار پڑھا کرتے۔ مگر ان اشعار میں بدقسمتی سے وزن کی غلطیاں ہوتیں۔ قصے کے مطابق حافظ اپنے شعر بڑے ٹھاٹھ سے پڑھا کرتے اور جلد ہی ان سخن فہموں کا نشانۂ تضحیک بن گئے۔ جو اس دکان پر اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔ قدرتی بات تھی کہ حافظ نے اس کا احساس کیا اور ان کو بڑا رنج پہنچا۔ اس پر وہ بابا کوہی کے مزار کے قریب چلے گئے اور چلّہ کاٹنا شروع کر دیا۔ ۲۳ ویں رات تھی کہ ان کو نیند سی آگئی اور انہوں نے خواب میں ایک نورانی چہرے کو دیکھا جس نے ان کو یہ خوشخبری سنائی کہ خدا نے اپنے فضل و کرم سے ان کو شعر گوئی کی بے پناہ قوت ودیعت فرمائی ہے۔ وہ جاگے تو انہوں نے محسوس کیا کہ وہ یکلخت شاعر بن گئے ہیں۔ اسی عالم سرمستی میں انہوں نے وہ غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے:

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند
واندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

اس واقعہ کے بعد ظاہر ہے کہ حافظ کے لئے تمام راستے ہموار ہو چکے تھے اور وہ ایک بے مثال غزل گو بن گئے۔ جس کا ثبوت ان کا دیوان ہے۔

یہ قصہ صداقت کی ایک رمق بھی نہیں رکھتا کیونکہ:

۱۔ کسی مستند داخلی یا خارجی شہادت سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

۲۔ اس قصے میں اس قدر اتفاقی امور جمع ہو جاتے ہیں کہ امکان کی حد سے باہر ہے۔

۳۔ اس خوشی کے موقعہ پر حافظ نے جو شعر کہے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ حافظ متصوفانہ افکار کی تمام اصطلاحات سے بخوبی آگاہ تھے اور اس لحاظ سے ہمیں یہ ماننا پڑیگا (اگر ہم قصے کو صحیح مان لیں) کہ حافظ راتوں رات

---

[۱] دیکھئے غیاث اللغات (شاخِ نبات)۔ یہ بات غور طلب ہے کہ محمد شاہ صاحب فرہنگِ اندراج شاخِ نبات کے اس قصے کو منبعِ خرافات تصور کرتا ہے۔

نہ صرف شعر علم معانی و بیان اور متعلقہ علوم ہی سے بہرہ ور ہو گئے بلکہ وہ صوفی بھی بن گئے اور انہوں نے ایک رات میں وہ تمام باتیں سیکھ لیں جو عام آدمی دس یا پندرہ سالوں میں سیکھتا ہے۔

۴۔ اس قصے کا شاخِ نبات کے قصے سے بھی بڑا گہرا تعلق ہے۔ جس کی بنیاد بھی محولہ بالا اشعار ہیں اور آگے چل کر ہمیں معلوم ہوگا کہ دوسرا قصہ بھی اسی قدر بے معنی ہے جس قدر یہ زیر بحث قصہ۔

دوسرے قصے کا خلاصہ یہ ہے کہ حافظ عنفوانِ شباب ہی میں ایک بدنام زمانہ رقاصہ کے دامِ الفت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اس کا نام شاخِ نبات تھا۔ حافظ کے پاس شعروں کے سوا کچھ نہ تھا، کہ وہ اس کی نذر کرتے یا کبھی کبھار ایک دو گلدستے اس کی خدمت میں پیش کرنا ان کے لئے ممکن ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں سے شاخِ نبات کی تسلی نہ ہوتی۔ جو اپنی دوسری ہم پیشہ عورتوں کی مانند (جو دنیا کا قدیم ترین پیشہ کئے ہوئے ہوتی ہیں)، سو شعروں کے مقابلے میں ایک مہر طلائی کو زیادہ وقیع گردانتی تھی۔ اس نے حافظ کو دھتکار دیا۔ اور محبت کی آگ میں جلا ہوا نوجوان حافظ آزردہ ہو کر بابا کوہی کے مزار پر چلا گیا اور وہاں پر روائتی چلہ کاٹنے کی ٹھان لی۔ دن کے وقت حافظ کبھی کبھی شہر چلا آتا کہ شاخِ نبات پر ایک دو نظریں ڈال لے جو بڑی نفرت سے اسے دھتکار دیتی)۔ ۳۹ویں دن جس کے بعد حافظ کو ایک رات مزید عبادت کرنا تھی اور جو محویت اور استغراق کا انتہائی مقام ہوتی ہے حافظ معمول کے مطابق شہر آئے وہ شاخِ نبات سے ملے تو انھوں نے فوراً محسوس کیا کہ اس کے رویے میں بڑا فرق آگیا ہے۔ وہ بڑی شرم و حیا، دل ربائی اور سپردگی کے عالم میں ان سے ملی۔ لیکن حافظ اس کی ترغیب کا شکار نہ ہوئے اور اپنا چلہ پورا کرنے کے لئے واپس چلے گئے۔ اس آخری رات انکو شعر گوئی کی قوت ارزانی ہوئی اور خدا نے اپنے فضل و کرم سے یہ قدرت بھی دی کہ وہ شاخِ نبات کی محبت کو علوی رنگ دے سکے انہوں نے اس دنیاوی محبت کو خیر باد کہا اور عشقِ الٰہی کے دیوانہ بن گئے۔ اسی پر انہوں نے محولہ بالا غزل کہی۔ اس غزل میں یہ شعر بھی آتا ہے:

این ہمہ شہد و شکر کز سخنم می ریزد
اجرِ صبریست کزاں شاخِ نباتم دادند

بعض لوگ جو اس قصے کی صحت پر یقین رکھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ یہاں شاخِ نبات حافظ کی محبوبہ کا نام ہے۔ یہ قصہ اور بھی زیادہ کھوکھلی بنیادوں پر قائم ہے۔ اور اسے محض یہ ثابت کر کے غلط قرار دیا جا سکتا ہے کہ شاخِ نبات حافظ کے شعروں میں استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد ان کا قلمِ نے زنگار ہے۔

۱؎ دیکھئے دیوانِ حافظ از حافظ محمد اسلم جیراج پوری۔ دیوانِ حافظ اردو ترجمے کا دیباچہ جو میر ولی اللہ نے لکھا ہے اور بشیر احمد ڈار کا ایک مضمون خواجہ حافظ شیرازی جو رسالہ اردو (جنوری ۱۹۲۹ء) میں شائع ہوا تھا۔

حافظ کہتے ہیں:

کلکِ حافظ شکریں شاخِ نبات است بچیں
کہ دریں باغ نہ بینی ثمری بہتر ازیں

اور :

حافظ چہ طرفہ شاخِ نبات است کلک تو
کز میوہ دلپذیر تراز شہد و شکر است

دورِ جدید کے تقریباً تمام مصنّفوں اور ناقدوں نے ان قصّوں کو غلط تسلیم کر لیا ہے لیکن بڑے تعجب کی بات ہے کہ یہ قصّے پاکستان اور ہندوستان میں اب بھی بیان ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دورِ جدید کے تمام ایرانی نقاد اور مؤرخ ان قصّوں کو کسی قسم کی اہمیت نہیں دیتے اور رضا زادہ شفق اور سلیم نیاری تو اس کا ذکر تک بھی نہیں کرتے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم ایران میں یہ قصّے اپنی طبعی موت کی آغوش میں سو چکے ہیں۔

اب جبکہ ان قصّوں کو پاک کیا جا چکا ہے ہمیں واقعات کا سراغ لگانا چاہیئے۔ لیکن اس سے قبل یہ بات لازم آتی ہے کہ حافظ کے قدیم سوانح نگاروں کے بارے میں چند ایک باتیں کہی جائیں۔ عوفی کی لباب الالباب[51] سے لیکر رضا قلی خان کی مجمع الفصحاء[52] تک تمام کتابیں عمومی طور پر حقیقت و افسانہ، واقعات و اساطیر اور یقین و قیاس کا عجیب و غریب مجموعہ ہیں۔ اس لئے یہ بات قطعی طور پر خالی از خلل نہیں کہ ہم ان کے مندرجات کو اس بنا پر کلیتاً رد کر دیں کہ ان کے مصنّف نے کسی مقام پر لغزش کھائی ہے یا خیال آرائی سے کام لیا ہے۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ ایسی کتابیں جنہیں غیر مستند سمجھا جاتا ہے بعض اوقات ہمیں ان باتوں کا سراغ دے جاتی ہیں جو کسی اور جگہ دستیاب نہیں ہوتیں۔ اور بعض اوقات متعلقہ موضوعات کے بارے میں جملہ معترضہ کے طور پر مفید معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ مثال کے طور پر دولت شاہ ہی کو لیجئے[53]۔ اس کے برعکس مستند کتابیں بعض قاری کی گمرہی کا سبب بنتی ہیں۔ اور ان میں ایسی معلومات جمع ہوتی ہیں جو صریحاً و بدیہاً غلط ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مصنّف انہیں درست سمجھتا ہو۔ اس قسم کی کتابوں میں مثال کے طور پر "چہار مقالہ" کا نام لیا جا سکتا ہے[54]۔

---

[51] تالیف ساتویں صدی ہجری۔

[52] تالیف تیرھویں صدی ہجری۔

[53] دولت شاہ مشہور و معروف تذکرۃ الشعراء کا مؤلف ہے۔ یہ کتاب ۸۹۲ھ کے قریب مدوّن ہوئی اور امیر علی شیر نوائی کے نام معنون کیا گیا

[54] یہ کتاب ایرانی نثر کی کتابوں میں کلاسیک شمار ہوتی ہے۔ اسے نظامی عروضی سمرقندی نے سلجوقی دور کے وسط میں ۵۵۰ھ کے قریب تصنیف کیا

اس بارے میں سب لوگ متفق معلوم ہوتے ہیں کہ میخانہ میں حافظ کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اگر اس میں سے غیر ضروری باتیں ختم کر دی جائیں اور ان قصوں کو علیحدہ کر دیا جائے جن کی ابھی ابھی تردید کی گئی ہے تو تمام معلومات بنیادی طور پر صحیح اور مستند ہیں۔ عبدالنبی مصنّف میخانہ بیان کرتا ہے کہ حافظ کے آباء و اجداد اصفہان کے رہنے والے تھے اور اتابکوں[1] کے عہد میں شیراز چلے آئے تھے۔ یہ اتابک، اسی مشہور و معروف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس نے اتابک سعد بن ابو بکر اور اتابک ابو بکر بن سعد کی بدولت بڑی شہرت حاصل کی ہے جنہوں نے سعدی کا مربّی بن کر اپنے خاندان کی روایات کو برقرار رکھا۔ حافظ کے والد سوداگری کرتے تھے اور اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ حافظ کی والدہ کازرون[2] کی رہنے والی تھیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ خاندان شیراز کے ایک مشہور علاقے میں رہتا تھا جس کا نام دروازہ کازرون تھا۔ عبدالنبی کے بیان کے مطابق باپ کی وفات کے بعد حافظ مفلسی کا شکار ہو گئے مگر اپنی تمام مشکلات کے باوصف وہ بڑے ذوق و شوق سے تحصیل علم میں منہمک رہے۔

گل اندام جس نے حافظ کی کلیات پر دیباچہ لکھا ہے بڑے واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ حافظ نے مطالع مصباح اور شرح کشاف کا مطالعہ کیا تھا۔ یہ کتابیں ان لوگوں کے لئے کافی ذہنی خوراک مہیا کر دیتی ہیں جنہیں خدا نے ذہانت ودیعت کی ہوتی ہے اور وہ ان کتابوں کے مطالب کو حسب منشا کام میں لا سکتے ہیں۔ اب چونکہ گل اندام جو نہ صرف حافظ کا معاصر ہی تھا بلکہ اس کا ہم سبق بھی رہ چکا ہے، واضح طور پر بتا دیتا ہے کہ حافظ نے مندرجہ بالا کتابوں کو خاص طور پر پڑھا تھا۔ اس لئے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ان کتابوں کے بارے میں چند ایک باتیں کہہ سن لی جائیں۔ اس سے ہمیں اس نصاب کا اندازہ ہو سکے گا۔ جو ان دنوں دیوانگانِ علم کو طے کرنا پڑتا تھا۔

کشاف قرآن مجید کی مشہور و معروف تفسیر ہے جسے زمخشری نے لکھا۔ جو اپنے وقت کے بڑے پائے کے عالم ہیں۔ (۴۶۷ھ سے ۵۳۸ھ تک) ان کا پورا نام ابوالقاسم محمود زمخشری الخوارزمی تھا۔ انہوں نے چند مفید لغات تصنیف کی ہیں۔ ان کے نام اصول البلاغت اور مقدمات الادب ہیں۔ مصباح عربی قواعد کی ایک کتاب ہے جسے مطرزی نے لکھا تھا اور اس کا شمار بھی کلاسیکی کتابوں میں ہوتا ہے۔ مطالع سے یا تو بیضاوی کی مشہور کتاب طوالع الانوار من مطالع الانظار مراد ہے اور یا پھر یہ شرح مطالع ہے جسے قطب الدین رازی نے لکھا تھا۔ اول الذکر کتاب فلسفے سے تعلق رکھتی ہے۔

---

[1] اتابکان فارس کے سلغر نامی ایک ترک کی اولاد تھے۔ ۵۴۳ھ سے ۶۸۶ھ تک اس صوبے پر حکمران رہے۔ اس خاندان کی آخری حکمران اکش خاتون تھی جس نے ہلاکو خان کے بیٹے منگو تیمور سے شادی کر لی تھی۔

[2] کازرون فارس کے صوبے میں ایک اچھا خاصا شہر ہے۔ اس زمانے میں یہاں سے شیراز کو ایک بہت بڑی سڑک جاتی تھی۔ مزید تفصیلات کے لئے ان کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ سرزمین خلافت مشرقی (انگریزی) از لاسترانج اور شیراز نامہ از ابوالعباس احمد مرتبہ بہمن کریمی تہران۔ ۱۳۱۰"

اور مؤخرالذکر منطق سے۔ قاضی بیضاوی نے جن کا شمار ان مشہور علمائے دین میں سے ہوتا ہے۔ جو سرزمین ایران سے اُٹھے۔ کچھ عرصہ تک شیراز کے قاضی القضاۃ کی حیثیت سے کام کیا۔ اور زندگی کے آخری ایام تبریز میں گذارے۔ جہاں ۶۸۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ قطب الدین رازی عضد الدین ایجی کے پیرو کار تھے۔ جن کی تعریف میں حافظ کسی قسم کے بخل سے کام نہیں لیتے۔ انھوں نے فلسفے اور منطق میں کمال حاصل کیا تھا۔

گل اندام بیان کرتا ہے کہ حافظ شیراز کے بہت سے علماء کے درس میں شامل ہوتے رہے۔ مگر اس سلسلے میں وہ قوام الدین عبداللہ کے خاص طور پر مرہون منت ہیں جس نے ۷۷۲ھ میں وفات پائی۔ یہ قوام الدین وہ حاجی قوام نہیں جس کا حافظ نے اپنے مشہور قطعہ میں ذکر کیا ہے بلکہ کوئی اور شخص ہے۔

جن کتابوں کا حافظ نے خصوصی مطالعہ کیا ان کا جائزہ لینے سے معلوم ہوگا کہ حافظ کے زمانے میں ذہنی پختگی کے حصول کے لئے دینیات، فلسفہ، منطق، قواعد اور متعلقہ علوم کی تحصیل ضروری تھی۔ یہ بات غور طلب ہے کہ ان میں ریاضیات کا ذکر موجود نہیں۔ یہ بات بڑی عجیب و غریب ہے۔ حالانکہ علامہ دوّانی صاحب اخلاق جلالی کی سند پر ہمیں یہ معلوم ہے کہ اس زمانے میں صفائے ذہن اور حصولِ علم میں میراور صحت کے لئے ریاضیات کا مطالعہ ضروری تھا۔[1] جو ایک واضح علم ہے خود ذوق وضاحت پیدا کرتا ہے۔

اگر ہم یہ باور بھی کرلیں کہ حافظ خستہ حالی کا شکار تھے (جیسا کہ صاحب میخانہ ہمیں یقین دلاتے ہیں) تو بھی ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ داخلی شہادت (حافظ کا کلام) کی بنا پر وہ ایک پختہ کار شخص معلوم ہوتے ہیں جن کے دل میں وادیٔ سلوک کی رہنمائی اور تصوف کے اسرار و رموز کی عقدہ کشائی کی لگن موجود تھی۔ خارجی شہادت (بالخصوص گل اندام کا دیباچہ) بھی اس امر کی تائید کرتی ہے۔ اور یہ فرض کئے بغیر ہمارے پاس کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ حافظ کا افلاس ان کی راہ میں حائل نہ ہوا۔ اور انھوں نے ان تمام علوم و فنون کا مطالعہ کیا، جو اس زمانے میں کسی شاعر کے لئے ضروری تھے اور خصوصاً ایک ایسے شاعر کے لئے جو عشق مجازی اور عشقِ حقیقی دونوں کا رسیا ہو اور ان وارداتِ تصوّف کا خوگر ہو جو غالباً کبھی اس پر نہ گذری ہوں۔ بہت سے مستشرقین اس بات کی طرف مائل ہیں اور وہ کسی حد تک حق بجانب بھی ہیں کہ حافظ صوفی تو تھے ہی نہیں اور جب وہ وارداتِ تصوف کا بیان کرتے تو وہ سرتاسر سُنی سنائی باتوں پر مبنی ہوتا۔ بہر حال یہ قرار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ حافظ بڑے انہماک سے مطالعہ میں مشغول رہے اور جب کبھی طبیعت حاضر ہوتی شعر بھی کہتے۔ چونکہ ان کا سن ولادت ۷۲۶ھ ہجری ہے اور وہ بے حد ذہین بھی تھے لہٰذا یہ امر لازمی ہے کہ ۷۴۵ھ کے قریب وہ ایک باکمال جوان ہو چکے تھے۔

---

[1] اخلاق جلالی نول کشور۔ ۱۹۱۶ صفحہ ۲۴۳۔

اس مقام پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان عوامل کا ذکر کیا جائے جن کے تال میل سے حافظ کے زمانے کا ماحول کا رنگ ڈھنگ معین ہوتا ہے جس چیز نے حافظ کو انسان کی حیثیت سے سنوارا اور اس کی فنی زندگی کی راہیں معین کیں وہ تو ان تمام عوامل کا مجموعی اثر ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہم ان عوامل پر الگ الگ بحث کرنے کے بجائے یہ بات قاری پر چھوڑتے ہیں کہ وہ ان عوامل کے مجموعی اثر کی قدر وقیمت کا اندازہ لگائے۔ یہ عوامل حسب ذیل ہیں:

۱۔ آخری ایلخانی بادشاہ ابوسعید بہادر کے زمانے میں اور اس کی موت کے بعد ایران میں اخلاقی اور سیاسی پراگندگی۔

۲۔ ابواسحاق انیجو کا کردار جس کی قربت حافظ کو اس زمانے میں حاصل ہوئی جب ان کی فنی زندگی کی راہیں معین ہو رہی تھیں۔

۳۔ عبید زاکانی سے جو ایران کا عظیم ترین طناز ہے حافظ کے تعلقات۔

۴۔ حافظ کی خواجو کرمانی سے ملاقات جو اپنے مرصع اسلوب کی بنا پر کہ ایرانی شاعری کے عراقی دبستان کا امتیاز ہے بہت مشہور تھا۔

۵۔ مظفریہ خاندان کے ہاتھوں ابواسحاق کی شکست اور اس سے پیدا ہونے والے واقعات۔

اب ہم ان عوامل کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ ابوسعید بہادر (پسر اولجیتو)، کہ آخری ایلخانی[1] شہزادہ تھا جس وقت تخت نشین ہوا تو اس کی عمر ابھی بارہ برس کی تھی۔ قدرتاً اس کے ارد گرد ایسے امرا جمع ہو گئے جنہیں اپنا اپنا الو سیدھا کرنا مقصود تھا۔ ان امرا میں زیادہ بااثر اور طاقتور امیر تین تھے۔ ایک امیر چوپان جو اپنے لڑکوں کی مدد سے عملی طور پر ابوسعید کی سلطنت کا کاروبار چلاتا تھا۔ دوسرے مشہور طبیب اور وزیر رشید الدین جو اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ اس کا اثر ہی ختم ہو گیا تھا۔ تیسرا تاج الدین علی شاہ تھا۔ یہ شخص رشید الدین کا مخالف تھا اور چاہتا تھا کہ اس کی جگہ حاصل کر لے۔ اسے اپنی ریشہ دوانیوں میں کامیابی حاصل ہوئی اور رشید الدین ۷۱۸ھ میں مارا گیا۔ اس کی عمر اس وقت ۷۳ سال کی تھی اور کسی کو نقصان پہنچانے کی خواہش یا قابلیت ہی اس میں باقی نہ رہی تھی۔ رشید الدین کی موت اور اس کے نتیجہ کے طور پر رونما ہونے والے واقعات نے سلطنت میں ایک ابتری پھیلا دی لیکن چودہ سالہ بادشاہ ابھی اتنا کم عمر تھا کہ وہ اپنے کئے کے نتائج کا احساس کر ہی نہ پایا۔ اب رشید الدین کے مخالف علی شاہ کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا۔ اس نے اس بوڑھے اور معزز وزیر کی جگہ حاصل کر لی اور اب ان کوششوں میں

---

[1] ایلخانیوں نے ۶۵۴ھ سے ۷۵۶ھ تک ایران پر حکومت کی۔

مصروف ہوگیا کہ کہیں اُسے بھی انہیں حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے جو اس کے پیش رو پر گذرے تھے۔ اس بات میں اُسے کامیابی حاصل ہوئی کہ وہ اپنی طبعی موت ہی مرگیا۔

رشید الدین کو قتل کروانے کے بعد ابوسعید ایلخان نے مزید نادانیوں کے ارتکاب پر کمر باندھی گویا ایک بے گناہ شخص کی موت جس نے سلطنت کی بڑی خدمت کی تھی کافی نہ تھی۔ اس نے بغداد خاتون سے اپنے عشق کا اظہار کرنا شروع کردیا۔ (بغداد خاتون امیر چوپان کی حسین وجمیل اور باعفت بیٹی تھی اور اس کی شادی امیر حسن گورکان جلائیر سے ہوچکی تھی۔ بادشاہ کہ اس عورت کی محبت کا دیوانہ تھا بے صبر ہوگیا۔ اور اس نے شعر کہنا شروع کردئے۔ ایک غزل میں اس نے اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا ہے:

بیا بہ مصر دلم تا دمشق جاں بینی

کہ آرزوئے دلم در ہوائے بغداد است

(اس شعر میں بغداد کے استعمال سے صنعتِ ابہام کا رنگ پیدا ہوا ہے) بادشاہ کو یہ خیال تھا کہ جونہی متعلقہ لوگوں کو اس کے جذبات کا علم ہوگا سب معاملات درست ہوجائیں گے۔ لیکن امیر چوپان نے یہ بات اپنی عزت اور وقار کے منافی سمجھی کہ اپنی لڑکی (جو اس وقت دوسرے کے عقد نکاح میں تھی) بادشاہ کے حوالے کردے اور ظاہر ہے کہ بغداد خاتون کے خاوند کو بھی اپنے سسر سے کامل اتفاق تھا۔ یہی بات کافی نہ ہوئی اور بغداد خاتون کے بھائی دمشق خواجہ نے جو اپنی دلیریوں اور راہِ فرار اختیار کرنے کی بناء پر بدنام تھا بادشاہ کی ایک بیوی سے عشق کرنا شروع کردیا۔ بادشاہ کو اس بات کا پتہ چلا۔ دمشق خواجہ کو پھانسنے کے لئے جال بچھایا گیا، لیکن وہ بچ نکلا۔ اس پر ابوسعید نے اپنی ناکامی، غصے اور بے عزتی کی بناء پر امیر چوپان کے خاندان کو برباد کرنے کے لئے مناسب کارروائی کی۔ کچھ عرصے کے بعد دمشق خواجہ اور امیر چوپان اس کے اشارے پر قتل ہوگئے اور اس نے بغداد خاتون کے خاوند کو مجبور کیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے اور بعد ازاں اس سے زبردستی شادی کی۔ ابوسعید کی اس پر بھی تسکین نہ ہوئی اور اس نے دمشق خواجہ سے غالباً انتقام لینے کے لئے اس کی بیٹی دلشاد خاتون سے شادی کرلی۔ ابوسعید ایلخان کے اس ناشائستہ طرزِ عمل اور ریاست کے تقریباً تمام اہم آدمیوں کی موت اور امیر حسن سے کشیدگی نے سیاسی صورتِ حالات کو بہت جلد خراب کردیا۔ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ اخلاقی اقدار پسِ پشت ڈال دی گئیں۔ چھوٹے موٹے امیروں نے بھی ایلخان اور دمشق خواجہ کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کیا۔ اور اپنی اخلاقی کمزوریوں اور بدنامیوں پر فخر کرنے لگے۔

دشتِ قبچاق کے حکمران ازبک خان نے ایک لشکرِ جرار کی ہمراہی میں آذربائیجان پر حملہ کردیا۔ اور وہ ابوسعید کو تخت وتاج سے محروم کردیتا اگر موت مداخلت نہ کرتی اور ابوسعید ۱۳ ربیع الآخر ۷۳۶ھ کو راہیٔ ملکِ عدم نہ

ہو جاتا۔ بغداد خاتون پر یہ شبہ کیا گیا کہ اس نے اپنے خاوند کو زہر دیا ہے اور یہی شبہ اس کے باپ اور بھائی کی موت اور خاندان کی مکمل تباہی کا باعث ہو گیا۔ اسی بنا پر بغداد خاتون کو بھی بڑی بے رحمی سے ٹھکانے لگا دیا گیا۔ اور اس بات سے اس زمانے کی معاشرتی ابتری اور زوال کا ایک اور ثبوت ملتا ہے۔

بغداد خاتون کے خاوند امیر حسن گورکان جلائیر نے اب موقع غنیمت سمجھا کہ دلشاد خاتون سے شادی کر لے جو ایک بچے کی ماں بن چلی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ابو سعید کا کوئی ایسا جائز وارث میدان میں ہو جو اس کا دستِ نگر نہ ہو۔

۷۳۶ھ میں ابو سعید کی موت سے ایلخانی سلطنت کا شیرازہ بالکل بکھر گیا۔ منتظم امراء نے ایران کے مختلف حصوں میں چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم کر لیں۔ ان میں سے اہم ترین ریاستیں یہ تھیں:

ا۔ جلائیر خاندان کی سلطنت جسے امیر حسن نے ۷۴۰ھ میں ابو سعید کی سلطنت کے ایک حصے میں قائم کیا تھا۔ ایران اور بغداد پر ان لوگوں کا سکہ چلتا تھا۔ یہ ادیبوں اور شاعروں کی بڑی قدر دانی کیا کرتے تھے۔ ان میں عبید زاکانی اور سلمان ساوجی بھی شامل تھے۔ سلمان ساوجی نے دلشاد خاتون کی تعریف میں بڑے اچھے قصیدے لکھے ہیں۔

ب۔ امرائے چوپان کی حکومت: یہ لوگ امیر چوپان کے بیٹے تیمور تاش کی اولاد میں سے تھے۔ انہوں نے ایران اور آذربائیجان پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ان کی حکومت ایک شعلہ مستعجل تھی۔ اور چودہ سال کے بعد ۷۵۸ھ میں ختم ہو گئی۔

ج۔ خاندانِ انیجو۔ اس خاندان میں قابلِ ذکر شخص ابو اسحاق ہی ہے۔ جس نے ۷۴۲-۷۴۳ھ میں فارس پر قبضہ کر لیا۔ اور مبارز الدین کے ایماء پر ۷۵۸ھ میں قتل ہو گیا۔ یہ حافظ کا پہلا مربی تھا۔

د۔ خاندانِ مظفر۔ اس خاندان کے بانی مبارز الدین نے کرمان اور یزد اور کرمان پر قبضہ کر لیا۔ لیکن بعد ازاں ابو اسحاق سے اس کی چل گئی۔ یہ خاندان ۷۲۳ھ سے ۷۹۵ھ تک برسرِ اقتدار رہا۔ تیمور نے ان کی سلطنت اپنی قلمرو میں شامل کر لی۔ اس خاندان کے شہزادوں سے ہم صفحاتِ آیندہ میں تفصیل سے بحث کریں گے۔ کیونکہ ابو اسحاق کی وفات کے بعد یہی حافظ کے مربی ہوئے۔

ظاہر ہے کہ حافظ اپنے خلوت کدہ دل میں جا چھپے۔ انھوں نے اس جاہ و ہوس، اخلاقی گراوٹ اور بداندیشی کی دنیا سے کنارہ کر کے اپنی دنیا آباد کی، جس میں شراب و لالہ و گل، معشوقانِ دلفریب اور کبھی کبھی چند ایک کتابیں انسان کو عالمِ سرمستی میں پہنچا دیتی ہیں۔ جہاں صرف خیر و خوبی کا گذر ہوتا ہے۔ یہ فراری رویہ عبید زاکانی کے ردِ عمل کے بالکل برخلاف تھا جو حافظ کا معاصر تھا۔ اس نے عالمِ خیال میں پرواز کرنے سے انکار کیا۔ اور اس کمندِ خاک میں مگن رہتے ہوئے اپنے زمانے کی مجلسی برائیوں کے خلاف ایک جہاد شروع کر دیا۔

(باقی آیندہ)